مولانا شبلی نعمانی

(حالاتِ زندگی)

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندوال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ ہی میں مولوی شکراللہ سے حاصل کی۔ پھر فارسی، عربی اور ادبیات کی تعلیم محمد فاروق صاحب سے غازی پور میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز کے سفر کیے۔ اُنیس برس کی عمر میں فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے گئے۔ اور سفر کے دوران وہاں کے کتب خانوں سے پورا فائدہ اُٹھایا۔

علامہ شبلی کے والد وکیل تھے۔ اُن کے اصرار پر شبلی نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لیکن جلد ہی بددل ہوکر یہ پیشہ چھوڑا۔ اور ''آمین دیوانی'' کی ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی جو علی گڑھ میں پڑھتے تھے؛ سے ملنے گئے۔ جہاں سرسید سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے آپ کو کالج میں پروفیسر مقرر کر لیا۔ وہاں سرسید کے کتب خانے سے استفادہ کا موقع ملا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران اُنھوں نے پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی بھی سیکھی۔

آخری عمر میں اعظم گڑھ آ گئے اور وہاں ادارہ ''دارالمصنفین'' قائم کیا۔ اور اس کے لیے اپنا کتب خانہ، باغ اور مکان وقف کر دیا۔ اِس ادارے نے اسلام و اسلامیات کے بارے میں قابلِ قدر کتابیں شایع کیں۔ انگریزی حکومت نے آپ کو علمی خدمات کے صلے میں ''شمس العلما'' کا خطاب دیا۔

شبلی نے سوانح عمریوں کے ذریعے مسلمانوں کو اُن کے درخشاں ماضی کی یاد دلا کر مستقبل کی تعمیر پر راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا بیان رنگین اور لہجہ پرجوش ہے۔ اُن کی تحریروں کو پڑھ کر جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ تحریر میں اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اُن کے چھوٹے جملوں میں وہ معانی ہوتے ہیں جو پوری عبارت میں بھی نہیں سماتے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتے ہیں۔

اُن کی تحریروں کو پڑھ کر اُن کی علمیت کا رُعب بیٹھتا ہے۔ ان کی تحریر سادگی کے باوجود ایک عالم کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ وہ شاعری کے انداز میں اپنی نثر میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال کرتے ہیں اور نثر میں بھی اپنے شاعرانہ تخیّل سے بھرپور کام لیتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں طنز کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اُن کی نثر سلیس، رواں اور بے ساختہ ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں فارسی تراکیب کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ تاریخ نویسی اور تنقید نگاری میں اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

(مولانا شبلی نعمانی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو مسلمانوں کے قدیم طرزِ تعلیم سے آگاہی دینا۔
۲۔ مجازی اور اصلاحی مختصر سے طلبہ کو روشناس کرانا۔
۳۔ اُردو زبان وادب میں مولانا شبلی نعمانی کی خدمات کو تفصیل سے بتانا۔
۴۔ مولانا شبلی نعمانی کے طرزِ تحریر میں منفرد اسلوب کی نشان دہی کرنا۔

خاص الفاظ وتراکیب: تصنیف وتالیف ۔ اسماء الرّجال ۔ متعلقات ۔ حلقۂ درس ۔ مُستند ۔ مسافتوں
کامل شناسا ۔ بحث ومناظرہ ۔ درسگاہ ۔ پایہ شناس

۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف وتالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو تعلم وتعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے۔ جدید طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند وروایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا لیکن سو برس کی مدّت میں تمدّن بہت کچھ کر گیا اور اُسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتّب و باقاعدہ ہو چکی تھی۔ اس دور میں جن علوم کو رواجِ عام حاصل ہوا وہ معانی، لغت، فقہ، اُصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان سے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا۔ مگر رواجِ عام نہ حاصل کر سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اُس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت اور کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ ومنطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے۔ دیکھو ٹیکس سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رُک چلا ہے۔ مفتوحہ ممالک میں امن وانتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستانِ عرب سے نکل کر دُور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں ہیں اور نہ ہی مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمران ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت اور تمدّن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم وفنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام اور اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی

صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہیں۔ جن میں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں، اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے اور علما کے ذاتی مکانات ہیں۔ لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس وقت اس زمانے کا کوئی رجسٹر موجود نہیں جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑوں، ہزاروں کتابیں موجود ہیں؛ جن سے ہم صحیح اندازے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات، تخت گاہوں کی بربادی، سپین کی تباہی اور تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اسی وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں بنانے کی تاریخ نگاہ سے چھپ گئی ہے۔ تاہم ہر عہد میں ہم سینکڑوں ماہرین و مجتہدینِ فن کا نشان دے سکتے ہیں۔ صرف ہم عصر و ہم وطن اہلِ کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر سپرنگر (Dr. Sprenger) صاحب تخمینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کسی نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہو سکتا ہے۔

مشہور علما کے تعلیمی حالات پڑھو۔ ایک ایک استاد کے حلقۂ درس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم مشغولِ درس نظر آئیں گے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔

اُس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی املا جس کو اُردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں۔ اُستاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب علم جو ہمیشہ قلم دوات لے کر بیٹھتے تھے اُن تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اِس طرح ہر ایک کی مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور ''امالی'' کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دُور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہلِ کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اُٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہلِ فن کی لائف چھان ڈالو؛ اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوا اُس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغداد، نیشاپور اور قرطبہ وغیرہ میں گو ہر فن کے کامل شناسا موجود تھے مگر اُن شہروں کے رہنے والے بھی مشرق مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔ علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا

حصہ انہیں علما کے حالات میں ہے جو سپین سے مصر، شام اور بغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر سپین میں داخل ہوئے۔ جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لیے ہمیشہ مسلمان سفر کرتے رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔ مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے، بعض امرا اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب اور نحو وغیرہ پر علم کے لیے جداگانہ مجلسیں ہوتی تھیں۔ ان میں علما اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے جن میں زیادہ تر حق پسندی اور انصاف کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصابِ تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پُراثر تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عطا کرتا تھا جس میں اُس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں وہ طیلسان (چغہ) پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علما کا مخصوص لباس تھا۔

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے۔

۱) دینی تعلیم مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی۔ قرآن و حدیث (جن پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے۔ اس لئے نحو، صرف، لغت، معانی اور اسماء الرّجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے۔ فلسفے نے علمِ کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی۔ اس سلسلے نے بڑھتے بڑھتے تقریباً ہر علم و فن کو اپنے دائرے میں لے لیا تھا۔ اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے۔ جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے۔ جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے۔ جب کسی کام پر پوری توجہ مائل ہوگی تو اسے کس حد تک پہنچا کر رہے گی۔ عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کر چکی تھیں مذہب نے ان کو بھی انہیں سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا جو عرب کے ذاتی خاصے تھے اور چوں کہ وہ مدّت سے تمدّن و معاشرت کی آبادی میں بسر کرتے آئے تھے، تعلیم کے معاملے میں انہوں نے اپنے استاد (عرب) سے زیادہ کام کیا ہے۔ یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول فقہ اور فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں۔

۲) تعلیم مسجدوں اور علما کی خاص درس گاہوں میں مقیّد نہ تھی۔ وزراء، حکام، فوجی افسر اور اہلِ منصب ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیرالاشغال وقت میں بھی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا۔ اہلِ کمال کے زمرے میں سیکڑوں گذرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب علم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

۴) امرا اور اہلِ منصب کا گروہ جو شائقینِ علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت

بڑا سبب تھا۔ سلاطین و وزرا تو ایک طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چوں کہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے بدل نہ تھیں بلکہ صرف اُن کا ذاتی کمال اور قبولِ عام مہنگے داموں خریدا جاتا تھا، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زورِ طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدر دانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحبِ نظر اور نکتہ چیں تھے۔

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتاً کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ نصابِ تعلیم قریباً وہی ہے جو پہلے تھے۔ پرائیویٹ تعلیم گاہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک اُن پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدّت معین ہو چکی تھی، گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی۔ مثلاً مغرب (مراکو) وغیرہ میں سولہ برس اور تیونس میں پانچ برس طالبِ علم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا۔ املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق و امثال کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ نذر ہو گیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصودِ اصلی تھی اُن پر پوری توجہ ہو سکتی۔ تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا، اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا۔ پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔ ان مدرسوں میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی۔

انقلاباتِ حکومت جو کثرت سے ممالکِ اسلامی میں ہوا کیے علمی مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے ایک خاندان گو کلیتًا برباد ہو جاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے۔ جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے تھے دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کر سکتی تھی۔ ہلاکو خان نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا۔ تاہم اوقاف میں کچھ تصرّف نہ کر سکا۔ اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقّق طوسی کے ہاتھ میں دیے جس کا بہت بڑا حصہ محقّق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالکِ اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکامِ سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومتوں سے زیادہ فیاضیاں دکھائے۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے۔ ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات و صنائع کو مدرسوں کے احاطے سے باہر ڈھونڈنا

چاہیے۔ مدرسوں کی کثرت اور عالم گیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا۔ ۷۴۸ھ میں جب کہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سَلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا ہے یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں۔ ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

(مقالاتِ شبلی)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) ابتدا میں مسلمانوں کی تعلیم و تعلم کا کیا طریقہ تھا؟

ب) بقول مصنف تعلیم کا دوسرا دور کن دلچسپیوں سے بھرا ہے؟

ج) اُس دور کے درس و تدریس کے بارے میں علامہ ذہبی کیا لکھتے ہیں؟

د) اعلیٰ تعلیم کے لیے کیا ضروری تھا؟

ہ) تیسرے دور کے طرزِ تعلیم نے پہلے ادوار کے طرزِ تعلیم کو کس طرح متاثر کیا؟

و) ممالک اسلامی میں نئی حکومت کے استحکام کے لیے کونسی شرط لازمی تھی؟

۲۔ سبق کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) قدیم طرزِ تعلیم کا زیادہ تر تعلق تھا۔

i) تجربے سے　　ii) حافظے سے

iii) معلومات سے　　iv) فہم سے

ب) ڈاکٹر سپرنگر کے بقول مسلمان علما کی اسماء الرجال تھی۔

i) چار لاکھ　　ii) پانچ لاکھ

iii) چھ لاکھ　　iv) سات لاکھ

ج) دوسرے دورِ تعلیم کا مستند طریقہ تدریس تھا۔

i) تفتیش کا ii) بحث کا

iii) املا کا iv) منصوبے کا

د) دوسرے دورِ تعلیم میں ضروری خیال کِیا جاتا تھا۔

i) ذاتی لائبریری کو ii) دور دراز سفر کو

iii) اتالیق مقرر کرنے کو iv) تحقیق و جستجو کو

ہ) قدیم دور میں جو شخص سفر کی زحمت اُٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوجاتا تو لوگ اُسے دیکھتے تھے۔

i) رشک کی نگاہ سے ii) شک کی نگاہ سے

iii) حیرت کی نگاہ سے iv) غضب کی نگاہ سے

۳۔ سبق کے مطابق درج ذیل میں سے دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) تعلیم مسجدوں اور علما کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی۔

ب) اعلیٰ تعلیم کے لیے مناظرہ لازمی تھا۔

ج) پہلے اور دوسرے دورِ تعلیم میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی۔

د) تیسرے دور میں فلسفہ و منطق کی تعلیم عام تھی۔

ہ) اسلامی ممالک میں انقلاباتِ حکومت نے تعلیم کو بہت تقویت دی۔

۴۔ سبق کے مطابق خالی جگہیں پُر کریں۔

الف) مغرب میں تعلیم سے فارغ ہونے کے لیے .... برس کا عرصہ درکا تھا۔ (بارہ۔ چودہ۔ سولہ)

ب) املا کے طریقے کو چھوڑنے کی وجہ سے تیسرے دور کی تعلیم کو .... کر دیا۔ (بہتر۔ ابتر۔ کم تر)

ج) تیسرے دور نے .... تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ (زبانی۔ علمی۔ کتابی)

د) بغداد کے علمی خزانے کو .... نے برباد کیا۔ (ہلاکو خان۔ چنگیز خان۔ قبلائی خان)

ہ) قدیم دور میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی تعداد .... ہوا کرتی تھی۔ (کم۔ زیادہ۔ مناسب)

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

"تعلیم کا یہ دوسرا دور .... حکومت اپنی بے تعلق اور اوپری ہے"۔

۶۔ سبق ''مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۷۔ درس و تدریس کے دوسرے دور کی چند خصوصیات بیان کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ طلبہ کے درمیان قدیم طرزِ تعلیم اور جدید طرزِ تعلیم پر مباحثہ کرائیں۔

۲۔ مجازی اور اصلاحی محضر میں طلبہ سے ان کی ذاتی رائے لیں۔

۳۔ لائبریری میں موجود مولانا شبلی نعمانی کے دیگر اور مضامین کے مطالعہ کی ترغیب دیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو مسلمانوں کی قدیم طرزِ تعلیم سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو مولانا شبلی نعمانی کے اُسلوبِ تحریر سے واقفیت دلائیں۔

۳۔ اُردو زبان و ادب کے لیے مولانا شبلی نعمانی کی خدمات پر مفصل لیکچر دیں۔